

یکساں سول کوڈ

دلائل و حقائق کی روشنی میں



مولانا وحید الدین خاں

پکساں سول کووڈ

دلائل و حقائق کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خان

پیکساں سول کوڈ

دلائل و حقائق کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خان

Al-Risala Book Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128 Fax: 91-11-4697333

No Copyright: No prior permission is required from the publisher to reproduce this booklet in any form or to translate it into any language.

یکساں سول کوڈ

یکساں سول کوڈ کا تصور آزادی (۱۹۴۷) کے پہلے سے ہندستان میں چلا آ رہا ہے۔ مگر اب وہ زیادہ تر دستور ہند کا مسئلہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ملک کا جو دستور بنا اس میں یونیفارم سول کوڈ کے نام سے اس کی بھی ایک باقاعدہ دفعہ شامل کر دی گئی۔ یہ دستور کی دفعہ ۴۴ ہے جو اس کے رہنما اصولوں کے تحت درج کی گئی ہے۔

دستور: غیر ضروری طوالت

دستور ایک اعلیٰ قانونی دستاویز ہے۔ دستور کا مقصد ان بنیادی اصولوں کا تعین ہے جس کی روشنی میں قومی حکومت (یا کسی اجتماعی ادارہ) کو چلایا جاسکے۔ خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے دستور کو مختصر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دستور جتنا لمبا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں اختلافات پیدا ہوں گے اور بار بار اس میں ترمیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس طرح دستور کا احترام حتم ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ طوالت اور پیچیدگی کی بنا پر آخر کار ایسا ہوگا کہ صرف کچھ ماہرین دستور ہی اس کو جانیں گے۔ عام شہریوں کو اس سے کوئی واقفیت یا دل چسپی باقی نہ رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی شہرت کے ماہر دستوریات (constitutionalism) اسکائسن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ فیلمن (David Fellman) سے لے کر انڈیا کے سب سے بڑے ماہر دستور مسٹر نانی پالکھی والا تک نے مختصر دستور کی حمایت کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام ترقی یافتہ قوموں کے دستور نہایت مختصر ہیں۔ مثلاً غیر ترقی یافتہ ریاست جارجیا (Georgia) کا نظر ثانی شدہ دستور پانچ لاکھ (500,000) الفاظ پر مشتمل ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ امریکہ (United States) کا دستور صرف سات ہزار الفاظ پر مبنی ہے۔ اسی طرح جاپان کا دستور انتہائی مختصر ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ قوموں کے درمیان نمبر ایک قوم کی حیثیت حاصل ہے

(5/85-86)

انڈیا کا دستور غالباً تمام قومی دستوروں میں سب سے زیادہ لمبا ہے۔ بارہ تفصیلی شیڈول (schedules) کے علاوہ اصل دستور ۳۹۵ دفعات پر مشتمل ہے۔ جب کہ اکثر دفعات کی ذیلی دفعات

بھی ہیں۔ اس لمبی دستور سازی کا نادرست ہونا اسی سے ثابت ہے کہ نومبر ۱۹۴۹ء کے بعد سے اب تک اس میں تقریباً ۸۰ ترمیمات ہو چکی ہیں اور مزید ترمیم کا مطالبہ جاری ہے۔ ان سب کے باوجود یہ ”جامع“ دستور ملک کو ترقی کے راستہ پر آگے لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد انڈیا کی دستور ساز اسمبلی کے صدر (۱۹۴۶-۴۹) تھے۔ یہ دستور اگرچہ انھیں کی زیر صدارت بنا اور اس کی تکمیل کے بعد انھوں نے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو اس پر اپنا دستخط کیا۔ تاہم وہ لمبی دستور سازی کے خلاف تھے :

In his valedictory address to the constituent Assembly Dr Rajendra Prasad said that everything cannot be written in the Constitution and hoped for the development of healthy conventions. But these have not been developed and everything has to be written in the Constitution.

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی میں اپنا الوداعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ دستور میں ہر چیز لکھی نہیں جاسکتی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ صحت مندر و ایات قائم کی جائیں گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس یہ ذہن بن گیا کہ ہر چیز کو دستور میں لکھ دیا جائے (ہندستان ٹائمز ۲۴ مئی ۱۹۹۵) کسی دستور کی غیر ضروری طوالت اس میں غیر ضروری دفعات کو شامل کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہندستانی دستور میں اس قسم کی کثیر غیر ضروری دفعات شامل ہیں انھیں میں سے ایک ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں (directive principles) کی دفعہ ۴۴ ہے جو مشترک سول کوڈ سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے گی کہ انڈیا کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ حاصل ہو جائے :

The State shall endeavour to secure for the citizens a uniform civil code throughout the territory of India.

دستور کی یہ دفعہ اتنا ہی غیر دستوری ہے جتنا یہ کہنا کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے کہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے یکساں فہرست طعام (uniform menu) وجود میں آجائے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ ملک کے تمام مرد و عورت اور بوڑھے اور بچے ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں اور ایک ہی قسم کا لباس پہنیں۔ اسی طرح یہ بھی یقینی طور پر ممکن نہیں ہے کہ ایک بڑے ملک کے تمام مرد و عورت

ایک ہی ڈھنگ پر شادی کی رسوم ادا کریں، خواہ اس کے لیے باقاعدہ قانون کیوں نہ بنا دیا جائے۔ دستور کا کام قومی پالیسی کے بنیادی اصولوں کو متعین کرنا ہے نہ کہ نجی معاملات میں لوگوں کے انفرادی ذوق کو مٹا کر غیر ضروری طور پر یکسانیت لانے کی کوشش کرنا۔ تاہم جب کوئی چیز لکھ کر چھاپ دی جائے تو بہت سے لوگ اس کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہی حال دستور کی اس دفعہ کا بھی ہوا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس کا حوالہ دے کر مانگ کرتے رہتے ہیں کہ یکساں سول کوڈ کا دور لانے کے لیے پارلیمنٹ ایک قانون بنائے اور اس کو پورے ملک میں رائج کیا جائے۔

نہرو رپورٹ

پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کا ذہن کافی پہلے سے چلا رہا ہے۔ غالباً اس کا اظہار سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں نہرو رپورٹ کی صورت میں ہوا۔ نہرو رپورٹ حقیقتاً آزاد ہندستان کے دستور کا ایک پیشگی ڈرافٹ تھا جس کو مشہور ماہر قانون موتی لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ اس دستوری مسودہ میں تجویز کیا گیا تھا کہ آزاد ہندستان میں شادی بیاہ کے معاملات کو یکساں ملکی قانون کے تحت لایا جائے گا۔ اس وقت علماء نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مزید یہ ہوا کہ اس وقت کی بٹس حکومت نے بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں ہندستان کے لیے درجہ مستقرہ (dominion status) کی بات کہی گئی تھی جو انگریزوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۳۹ میں اس پر غور کرنے کے لیے کانگریس کا ایک اجلاس لاہور میں بلایا گیا۔ اس اجلاس نے اس کے عملی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو رد کر دیا۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ

۱۹۸۵ سے یکساں سول کوڈ کے مسئلہ نے نئی قانونی اہمیت اختیار کر لی جب کہ سپریم کورٹ کے ججوں نے اس کے حق میں اپنی رائے دینا شروع کر دیا۔

اس معاملہ میں عدالتی بحث کا آغاز سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹروائی وی چندرا چوڈ کے فیصلہ سے ہوتا ہے۔ ۱۹۸۵ میں انھوں نے محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں اپنا مشہور فیصلہ دیا تھا۔ اس فیصلہ میں اصل زیر بحث معاملہ سے تجاوز کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس کی

کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے تحت قانون بنا وقت کا تقاضا ہے۔ اور یہ کہ ایک کامن سول کوڈ قومی ایکٹ کو لانے میں مددگار ہوگا :

a common civil code will help the cause of national integration.

اس کے بعد اسی ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ کے جسٹس چن نپا ریڈی نے ایک کیس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیس ایک اور مثال ہے جو اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ کیساں سول کوڈ ہماری فوری اور ناگزیر ضرورت بن چکا ہے :

The present case is yet another which focuses...on the immediate and compulsive need for a uniform civil code.

یہی بات زیادہ مفصل اور تاکیدی انداز میں سپریم کورٹ کی دور کنی ڈویژن نے سب نے مئی ۱۹۹۵ میں اپنے متفقہ فیصلہ میں کہی ہے۔ اس کے ممبران جسٹس گل دیپ سنگھ اور جسٹس آر ایم سہاسے تھے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے مطابق، یونیفارم پرسنل لا کو نافذ کرنا قومی استحکام کی طرف ایک فیصلہ کن قدم ہے۔ اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ کسی بھی وجہ سے ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں تاخیر کی جائے :

to introduce a uniform personal law (is) a decisive step towards national consolidation... There is no justification whatsoever in delaying indefinitely the introduction of a uniform personal law in the country (p. 22).

دستور کی دفعہ ۴۴

یہ ساری باتیں دستور کی دفعہ ۴۴ کے حوالے سے کہی جا رہی ہیں۔ یہ دفعہ دستور ہند کے چوتھے حصہ میں ہے۔ یہ حصہ اسٹیٹ پالیسی کے لیے رہنما اصولوں (directive principles) کی حیثیت سے دستور میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی دفعہ ۳۲ میں یہ صراحت ہے کہ اس حصہ میں جو دفعات درج کی گئی ہیں وہ کسی بھی عدالت کے ذریعہ قابل نفاذ نہیں ہیں۔ اس کا تعلق تمام تر حکومت اور ریاست سے ہے۔ ایسی حالت میں سپریم کورٹ کے جموں کا بار بار دفعہ ۴۴ کے حوالے سے یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ چھیڑنا ایک ایسے مسئلہ میں دخل دینا ہے جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ جنتا دل نے اس

فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے (دی پائیر ۱۵ مئی ۱۹۹۵) اس کو اپنی حد سے گزر کر پارلیمنٹ کی حد میں داخل ہونا قرار دیا:

It is a judicial trespass on Parliament's jurisdiction.

اسی پس منظر میں دی ہندستان ٹائمز (۱۲ مئی ۱۹۹۵) نے اپنے ایڈیٹوریل میں فیصلہ پر تبصرہ کا آغاز اس جملہ سے کیا تھا کہ ————— ہندستان کی سپریم کورٹ نے حالیہ برسوں میں بار بار یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ وہ ایسے مقامات میں گھس پڑتی ہے جہاں داخل ہونے سے فرشتے بھی گھبراتے ہیں:

India's Supreme Court in recent years has displayed a penchant for rushing into terrain that angels fear to tread.

خود دستور کے مطابق، یونیفارم سول کوڈ کو ایکٹ کی صورت دینے کا تعلق تمام تر حکومت سے ہے۔ اور حکومت کا حال یہ ہے کہ ۱۹۵۶ میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف طور پر کہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ میں اس کو تکمیل تک پہنچاؤں:

I do not think that at the present moment the time is ripe in India for me to try to push it through.

یہی بات اس کے بعد اندرا گاندھی نے بھی کہی۔ اور اب موجودہ پرائم منسٹر پی وی نہہراؤ نے بھی یہی بات کہہ دی ہے (ٹائمز آف انڈیا، نی ڈہلی، ۲۸ جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۷) اب بڑی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو عملاً یونیفارم سول کوڈ لانا ہے وہ تو اس سے بے تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اختیار میں سرے سے اس کا معاملہ نہیں وہ اس کے حق میں پر جوش تقریریں کر رہے ہیں۔ اس قسم کی لفظی کارروائی صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مذہبی آزادی ایک لازمی حق

جو لوگ دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر یونیفارم سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے غالباً اس پر بہت کم غور کیا ہے کہ خود اسی دستور کی دفعہ ۲۵ میں اس کی تردید موجود ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں ہندستان کے ہر شہری کو ضمیر اور مذہبی عمل اور مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تمام افراد مساوی طور پر آزادی ضمیر کا حق رکھتے ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر مذہب کا اقرار کریں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں:

All persons are equally entitled to freedom of conscience and the right freely to profess, practise and propagate religion.

مذہب کا یہ انتخاب فرد یا گروہ کی خود اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ اسی لیے دفعہ ۲۵ کی تشریح (explanation I) میں کہا گیا ہے کہ سکھوں کی مذہبی آزادی میں ان کا یہ حق بھی شامل ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے ساتھ کرپان (تلوار) رکھیں۔ دستور میں "کلچرل رائٹس" کے تحت عمومی طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستانی شہریوں کا کوئی بھی طبقہ جو اپنا الگ کلچر اور زبان رکھتا ہو، اس کو حق ہوگا کہ وہ اپنے کلچر اور زبان کی حفاظت کرے (دفعہ ۲۹)

مزید یہ کہ مذہبی آزادی کی دفعہ جو دستور میں ہے وہ دستور کے اس حصہ میں ہے جس کا تعلق شہریوں کے بنیادی حقوق (fundamental rights) سے ہے، جب کہ مذکورہ دفعہ ۲۴م دستور میں دیے ہوئے رہنما اصول (directive principles) کے تحت آئی ہے۔ اور خود دستور کی دفعہ ۳۷ کے مطابق، اس کے رہنما اصولوں کی دفعات اس کے بنیادی حقوق کی دفعات کے تابع ہیں نہ کہ اس سے آزاد۔

ایسی حالت میں دستور کی دفعہ ۲۴م کا حوالہ دے کر حکومت سے یہ کہنا کہ وہ کیساں سول کوڈ کو بذریعہ قانون ملک میں نافذ کرے، خود دستور کی اپرٹ کے خلاف ہے۔ جب تک ملک میں کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس قسم کی قانون سازی کو اپنے مذہب میں بے جا مداخلت قرار دیتا ہے، اس وقت تک خود دستور کی رو سے ایسا قانون بنانا ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی پارلیمنٹ ایسا قانون بنائے اور ملک کا کوئی مذہبی گروہ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں مراجعہ کرے تو عدالت عالیہ جو دستور کی محافظ ہے، وہ یقینی طور پر ایسے قانون کو کالعدم قرار دے دے گی۔

دستور ہند میں مذہبی آزادی کی دفعہ کوئی سادہ بات نہیں ہے۔ یہ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) کے تحت ہے جس کو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ میں جاری کیا تھا، اور جس کا ایک مستقل ممبر ہندستان بھی ہے۔ اس منشور کے آرٹیکل ۱۸ میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ہر آدمی کو مذہب کی آزادی ہوگی۔ اس میں مذہب بدلنے کی آزادی اور اپنے پسندیدہ مذہب پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہندستان نے اس عالی منثور پر قومی حیثیت سے اپنا دستخط ثبت کیا ہے۔ اس طرح مذہبی آزادی ہر ہندستانی شہری کا ایک ایسا حق بن جاتی ہے جس کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جاسکتا۔

مذہب اور پرسنل لا

سپریم کورٹ کی مذکورہ دور کئی ڈویژن بنچ کے ۳۱ صفحہ کے فیصلہ (مئی ۱۹۹۵) میں اس قسم کی قانون سازی کا جواز یہ کہہ کر رکھا گیا ہے کہ نکاح و طلاق کے معاملہ کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ملکی قانون سے ہے۔ جسٹس کلڈیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ دستور کی دفعہ ۴۴ اس تصور پر مبنی ہے کہ مذہب سماج میں مذہب اور پرسنل لا کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں۔ اس کی دفعہ ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے جب کہ دفعہ ۴۴ سماجی تعلقات اور پرسنل لا کو مذہب سے الگ کر رہی ہے :

Article 44 is based on the concept that there is no necessary connection between religion and personal law in a civilised society. Article 25 guarantees religious freedom whereas Article 44 seeks to divest religion from social relations and personal law.

یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ مذہب کا تعلق، تمام علماء مذہب کے اتفاق کے مطابق، تین چیزوں سے ہے۔ عقیدہ، عبادت، اخلاقی اقدار (ethical values) اور اخلاقی اقدار میں بلاشبہ یہ بات سرفہرست ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان جائز جنسی تعلق کی صورت کیا ہو۔ نکاح کا تعلق اسی اخلاقی مسئلہ سے ہے، اس لیے وہ لازمی طور پر مذہب میں شامل ہے۔

مذہب اور پرسنل لا کا یہ تعلق اتنا زیادہ واضح ہے کہ خود ڈیویژن بنچ کے اسی فیصلہ میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ چنانچہ بنچ کے دوسرے رکن جسٹس آر این سہاے اپنے علاحدہ فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ شادی، وراثت، طلاق، کنورژن اپنی نوعیت اور حیثیت میں اتنا ہی مذہبی ہیں جتنا کہ عقیدہ۔ آگ کے کنارے سات پھیرا کرنا یا قاضی کے سامنے ایجاب و قبول کرنا بھی اتنا ہی عقیدہ اور ضمیر کا مسئلہ ہے جتنا کہ خود عبادت :

Marriage, inheritance, divorce, conversion are as much religious in nature and content as any other belief or faith. Going round the fire seven rounds or giving consent before Qazi are as much matter of faith and conscience as the worship itself.

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دلیل سے نکاح کے معاملہ کو مذہب سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب نکاح و طلاق کا معاملہ مذہب کا معاملہ ہے تو دستور کی دفعہ ۲۵ کے مطابق، کسی بھی پارلیمنٹ یا کسی بھی ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی گروہ کے اس مسئلہ حق کو اس سے چھین لے اور اس کی مرضی کے بغیر اس کے اوپر ایسا قانون نافذ کرے جو مذکورہ دفعہ کے مطابق، اس کے مذہبی معاملہ میں مداخلت کے ہم معنی ہو۔

کامن کوڈ اور قومی ایکٹ

کامن سول کوڈ کا مقصد کیا ہے۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہے گا کہ کامن کوڈ برائے کامن کوڈ (common code for the sake of common code) ہمارا مقصد ہے۔ پھر اس کا اصل مقصد کیا ہے، اس کے تمام وکیل متفقہ طور پر اس کا ایک ہی فائدہ بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں باہمی قربت پیدا ہوگی۔ اور مشترک قومیت کو وجود میں لانے میں مدد ملے گی۔ کامن کوڈ لوگوں کے اندر کامن فیلنگ پیدا کرے گا۔ اس طرح وہ مضبوط انڈین نیشن وجود میں آجائے گی جس کا پچاس سال سے ہم کو انتظار ہے۔

مگر یہ محض قافیہ بندی کی بات ہے۔ صرف لفظی اشتراک کی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کامن کوڈ سے کامن فیلنگ کا ظہور ہوگا۔ حالانکہ دونوں میں کوئی لازمی رشتہ نہیں۔ تمام متعلق حقائق اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

جسٹس کلڈیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ حکومت نے ہندوؤں کے روایتی قانون کو کوڈ کی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ ہندو میریج ایکٹ ۱۹۵۵، ہندو سیکشن ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو اناریٹی اینڈ گارجین شپ ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو اڈاپشن اینڈ مینٹنس ایکٹ ۱۹۵۶ بنایا جا چکا ہے۔ ان قوانین نے روایتی ہندو قانون کی جگہ لے لی ہے جو کہ مختلف مکاتب فکر اور مذہبی کتابوں پر مبنی تھا۔ ان جدید قوانین نے ان سب کو ایک یونیفارم کوڈ کی حیثیت دے دی ہے۔ جب ۸۰ فی صد سے زیادہ شہری پہلے ہی سے مشترک پرنسپل قانون کے تحت لائے جا چکے ہیں تو اب اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو مزید التوا میں ڈالا جائے (صفحہ ۲)

جسٹس کلڈیپ سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ آخر حکومت کو کتنا زیادہ وقت چاہیے کہ وہ دستور ہند کی

دفعہ ۴۴ کے تحت دی ہوئی ہدایت کی تعمیل کرے۔ ہندوؤں کا روایتی قانون، ہندوؤں کا پرسنل لا جس کا تعلق وراثت، جانشینی اور شادی بیاہ سے ہے، بہت پہلے ۵۶-۱۹۵۵ میں متانونی کوڈ کی صورت اختیار کر چکا۔ اب کسی بھی قسم کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے کہ ملک میں یونینفارم پرسنل لا کے نفاذ میں غیر متعین تاخیر کی جائے۔ ہندوؤں کا پرسنل لا، جس کا تعلق شادی، جانشینی وغیرہ سے ہے، وہ سب اسی طرح مقدس سمجھے جاتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں یا عیسائیوں کے قانون۔ مگر ہندو اور ان کے ساتھ سکھ، بدھ، جٹ اور جینی فرقہ نے قومی اتحاد اور استحکام کی خاطر اپنے جذبات کو بھلا دیا۔ تاہم کچھ اور فرقوں نے ابھی ایسا نہیں کیا ہے، اگرچہ دستور پورے ہندوستان میں ایک ہی کامن سول کوڈ نافذ کرنے کی تاکید کرتا ہے (صفحہ ۲۱-۲۲)

جسٹس کل دیپ سنگھ کے فیصلہ کا جو اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اس موصوف کے نزدیک ملک کی بہت بڑی اکثریت (۸۰ فی صد سے زیادہ) اس مشترک عائلی قانون کے تحت بالفعل لائی جا چکی ہے جس کے لیے وہ مکمل قسم کا یکساں پرسنل قانون بنانے کی پُر زور وکالت کر رہے ہیں۔ پھر جب آبادی کی اتنی بڑی اکثریت میں مطلوب قانون عملاً آچکا ہے تو اس کے وہ مثبت نتائج کہاں ہیں جو اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی ہر سطح پر قومی یک جہتی کا فقدان ہے۔ لوگوں میں کوئی نیشنل گیر کٹر نہیں۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اجلاس کے دوران ایسے ہنگامے ہوتے ہیں کہ کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گاؤں پنچایتوں میں پہلے سے بھی زیادہ جھگڑے ہو رہے ہیں۔ عدالتوں میں نزاعی مقدمات کی بھرمار ہے۔ دو مختلف فرقوں سے بھی زیادہ ایک ہی فرقہ کے مختلف طبقات میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اکثر ریاستوں میں علاقائی ہنگامے جاری ہیں۔ حتیٰ کہ کئی ریاستوں میں علاحدگی کی تشددانہ تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کا سول قانون ایک ہی ہے۔ مگر ان جماعتوں نے اتنے بڑے پیمانہ پر باہمی لڑائی جاری کر رکھی ہے کہ ملک کا استحکام شدید طور پر خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ خود سپریم کورٹ کے مذکورہ جج صاحبان کے فیصلہ کے مطابق، اصل مسئلہ کامن کوڈ کے نفاذ کا نہیں ہے، بلکہ کامن کوڈ کے نفاذ کے باوجود نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم دوسری تدبیر تلاش کریں نہ کہ ناکام ہوجانے والی تدبیر کے مزید بے سود اعادہ پر اپنا وقت ضائع کریں۔

باہمی تفریق برٹش کی دین

آج جس "کامن ویلنگ" کی بات کی جا رہی ہے وہ اس سے پہلے صدیوں سے ہمارے ملک میں پوری طرح موجود تھی۔ ملک کے مختلف فرقے مل جل کر محبت کے ساتھ باہم زندگی گزارتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کامن سول کوڈ جیسی کسی چیز کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔ ہر فرقہ کی کلچرل شناخت الگ تھی، اور ہر ایک اپنی اپنی مذہبی روایت کے مطابق شادی بیاہ کی رسوم ادا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ چیز پوری طرح موجود تھی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

ہندستانی سماج کے اس توازن کو جس چیز نے برہم کیا وہ کوئی غیر کامن کوڈ نہیں تھا، بلکہ سابق برٹش حکومت کی وہ پالیسی تھی جس کو سابق لفٹنٹ جنرل کوک (General Coke) نے فارمولے کی صورت دیتے ہوئے کہا تھا کہ لڑاؤ اور حکومت کرو :

Divide and rule

اس غیر مطلوب صورت حال کا ابتدائی آغاز لارڈ ایلگن (James Bruce Elgin) کے زمانہ میں ہوا جو ۶۳-۱۸۶۲ میں ہندستان کا وائسرائے تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے سکرٹری آف اسٹیٹ مسٹر وڈ (Wood) نے لندن سے نئی دہلی میں مقیم وائسرائے کو خط لکھا کہ :

We have maintained our power in India by playing off one part against the other and we must continue to do so. Do all you can, therefore, to prevent all having a common feeling.

ہم نے ہندستان میں اپنا اقتدار وہاں کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف لڑا کر باقی رکھا ہے۔ ہمیں ایسا کرتے رہنا چاہیے۔ اس لیے لوگوں کو مشترک احساس سے روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو (دی ہندستان ٹائمز ۳۰ مارچ ۱۹۹۵)

برٹش حکمرانوں کی یہی سوچی سمجھی پالیسی تھی جس نے ہندستان کی بنی بنائی مشترک قومیت کو بکھیر دیا۔ انہوں نے ہر موقع کو استعمال کر کے لوگوں کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ انہوں نے حکومت کے تمام ذرائع سے کام لے کر باہمی نفرت کا ایک مصنوعی جنگل اگا دیا۔ بد قسمتی سے آزادی کے بعد بھی یہ آگ بجھائی نہ جاسکی۔ اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہی اس کی اصل وجہ ہے۔ اس کے علاوہ یونین فارم سول کوڈ کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یکساں کوڈ یکسانیت کا ذریعہ نہیں

یکساں کوڈ کا کوئی بھی تعلق یکسانیت یا باہمی اتحاد سے نہیں۔ ایک ہی سول کوڈ کو اپنانے والے بار بار آپس میں لڑتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، قدیم ہندستان میں کورو اور پانڈو دو رشتہ دار خاندان تھے، دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں وہ عظیم جنگ ہوئی جس کو ہما بھارت کہا جاتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اعلان کیا ہے کہ دہلی کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے اگلے الیکشن میں وہ قاتلانہ جبلت (killer instinct) کے ساتھ ہما بھارت برپا کرے گی (ٹائمز آف انڈیا ۲۴ جولائی ۱۹۹۵) اس نئی ہما بھارت کے دونوں فریق دوبارہ وہی لوگ ہیں جن کا سول کوڈ بالکل یکساں ہے۔

پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں ایک طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے، اور دوسری طرف برطانیہ اور فرانس وغیرہ۔ دونوں گروہوں میں ہلاکت خیز جنگ ہوئی۔ حتیٰ کہ مرنے اور شدید طور پر زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۰ ملین تک پہنچ گئی۔ یہ دونوں جنگ آزما فریق عیسائی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے یہاں وہی سول کوڈ رائج تھا جو کہ دوسرے کے یہاں رائج تھا۔ مگر یہ قانونی یکسانیت دونوں کو آپس میں لڑنے سے روکنے والی ثابت نہیں ہوئی۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۵-۱۹۳۹) میں ایک فریق کا قائد جرمنی تھا، اور دوسرے فریق کا قائد برطانیہ۔ دونوں کا کلچر اور سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ لڑی۔ دونوں کا "یکساں سول کوڈ" کو ماننا انھیں باہمی جنگ سے روکنے والا نہ بن سکا۔

سابق وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کو ۱۹۸۴ میں کچھ لوگوں نے مار ڈالا، جبکہ قاتل اور مقتول دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ پنجاب میں علیحدگی کی خونیں لڑائی جن دو فریقوں کے درمیان جاری ہوئی وہ دونوں ایک ہی سول کوڈ کو ماننے والے تھے۔ ہردن اخبار میں شوہروں اور بیویوں کے درمیان ظالمانہ سلوک کے واقعات چھپتے رہتے ہیں، جبکہ دونوں کے دونوں ایک ہی سول قانون سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں کروڑوں ہندوستانی ایک دوسرے کے خلاف سنگین الزامات لگا کر قانونی لڑائی لڑ رہے ہیں، حالانکہ بیشتر حالت میں دونوں فریقوں کا سول کوڈ ایک ہی ہوتا ہے۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کا بے فائدہ ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ کوئی نیا قانون بنا کر از سر نو اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دانشوران قوم کار عمل

سپریم کورٹ آف انڈیا کی ڈویژن بنچ کا فیصلہ (۱۰ مئی ۱۹۹۵) اخباروں میں چھپا تو برادران وطن اور دانشوران قوم کا رد عمل کثرت سے سامنے آیا۔ ایک طبقہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو اس طرح لیا گیا کہ یہ ملک کے موجودہ سماجی مسائل کا کوئی حتمی حل ہے۔ تاہم ان میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اور کسی ایک یا دوسری وجہ سے اس کو رد کر دیا۔ اس دوسرے طبقہ کے چند حوالے حسب ذیل ہیں۔

1. Politics of Uniform Civil Code
by Partha S. Ghosh
The Hindustan Times, New Delhi, May 22, 1995
2. Living with Religion
by Kuldip Nayar
The Statesman, New Delhi, May 31, 1995
3. Uniform Civil Code: Judiciary Oversteps its Brief
by H.M. Seervai
The Times of India, New Delhi, July 5, 1995
4. Personal Laws: Uniformity no Essential
by Balraj Puri
Indian Express, New Delhi, July 6, 1995
5. Civil Code: The Constitutional Perspective
by K.C. Markandan
The Hindustan Times, New Delhi, June 19, 1995.

نمونہ کے طور پر مسٹر بلراج پوری کے مذکورہ مضمون کے کچھ حصے یہاں اصل انگریزی میں نقل کیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کامن سول کوڈ کے تصور کو پوری طرح رد کر دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ :

سپریم کورٹ کے معزز بچوں نے قومی اتحاد کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس کی حمایت میں انہوں نے جو دلائل دیے ہیں، اس پر میرا اعتراض بہت بنیادی ہے۔ میرے نزدیک جج صاحبان، قومی تعمیر کے عمل میں برعکس طور پر اثر انداز ہوئے ہیں، ہندوستانی قوم کے مشترک کردار پر اور مسلمانوں کے درمیان نیز مسلمانوں اور دوسرے فرقوں، خاص کر ہندوؤں کے ساتھ ڈائلاگ پر جو کہ اس کے پرنسپل لاکھی اصلاح کے سوال پر جاری تھا۔ یہ کہہ کر کہ مسلم پرنسپل لاکھی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کو یکساں قانون کا حصہ نہ بنایا جائے، جج صاحبان نے مسلم خواتین کے معاملہ کو مسلمانوں کے طبقہ تشخص کے تابع کر دیا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے ایک اچھے مقصد کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔

یکسانیت اور اصلاح کے درمیان قطعی طور پر کوئی بھی منطقی ربط نہیں۔ اول الذکر کے خلاف کیس اتنا ہی ناقابل تردید ہے جتنا کہ وہ مؤخر الذکر کے معاملہ میں ہے۔ یکساں سول کوڈ، قومی اتحاد اور استحکام کے فروغ کے لیے کوئی قطعی چیز نہیں، جیسا کہ جج صاحبان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دستور ہند کی اسٹیٹ لسٹ میں ۶۶ اندراجات ہیں اور کانکرنٹ لسٹ میں ۴۷ اندراجات ہیں، جن کے معاملہ میں ریاستوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ الگ الگ قوانین بنا سکتی ہیں، اور ان میں یکسانیت ضروری نہیں ہے۔ اگر ریاستوں کی جغرافی اور ثقافتی عدم یکسانیت کی بنیاد پر بنائے جانے والے غیر یکساں قوانین ملک کے اتحاد کے لیے خطرہ نہیں ہیں تو غیر جغرافیائی نوعیت کے مذہبی گروہوں میں عدم یکسانیت سے وہ کیوں خطرہ بن جائیں گے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی فرقہ مذہب کی بنیاد پر اپنے لیے علیحدہ وجود کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مگر کیا ہم نے زبان کی بنیاد پر علیحدہ وجود کا اقرار نہیں کیا ہے اور زبان کی بنیاد پر از سر نو ملک کی تنظیم نہیں کی ہے۔ کیا منڈل اصول کے تحت ذات کی بنیاد پر شخص کو سیاسی جواز نہیں دیا گیا ہے۔ پھر معزز جج کیوں استثنائی طور پر صرف مذہبی گروہ کو علیحدہ شخص کا حق دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ ایک غیر منطقی روش ہے، اور سماجی اور سیاسی اعتبار سے مسلمہ حقائق کے خلاف ہے۔ کیا یہ شخص محض ایک جج کے اعلان سے ختم ہو جائے گا۔ (انڈین ایکسپریس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

There is absolutely no logical connection between uniformity and reform. The case against the former is as unassailable as it is for the latter. Nor is uniform law imperative, as the judges argue, for the promotion of national unity and solidarity. There are a number of 66 entries in the State List and 47 in the Concurrent List of the Constitution on which States are empowered to make laws without any obligation to conform to uniformity. If diversity of laws, based on geographical and cultural diversities of the States, has not threatened the unity of the country, would it be threatened only if the diversities are of non-territorial form as are religious communities?

Justice Kuldip Singh has proclaimed that no community could claim to remain a separate entity on the basis of religion. Have not we conceded separate entities based on languages and reorganised the country on a linguistic basis? Have not caste-based identities been recognised in the Mandal principle and all identities, cultural, tribal, caste and religious acquired political legitimacy? Why does the honourable judge single out the claim of a religious community for a distinct identity? It defies logic and socially and politically the accepted reality. Can this identity disappear by a mere pronouncement of a judge?

گر دو گولو الکر کے خیالات

آر ایس ایس کے سابق سرسچالک گر دو گولو الکر نے ۲۰ اگست ۱۹۴۲ کو دہلی میں دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کوئی ضروری چیز نہیں۔ ان کی یہ تقریر مد رلینڈ (۲۱ اگست ۱۹۴۲) میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ہفت روزہ آرگنٹائر (۲۶ اگست ۱۹۴۲) میں اس موضوع پر ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ یہ رپورٹ انگریزی میں اگلے صفحات میں درج کی جا رہی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا :

میں نہیں سمجھتا کہ نیشنلزم کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہمیں یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی قانونی یکسانیت کا قومی اتحاد سے کوئی تعلق نہیں۔ انڈیا ہمیشہ تنوع کا ملک رہا ہے۔ اس کے باوجود لمبی مدت سے ہم ایک طاقتور اور متحد قوم بنے رہے۔ اتحاد کے لیے ہمیں ہم آہنگی کی ضرورت ہے نہ کہ یکسانیت کی۔ میرا احساس یہ ہے کہ فطرت زیادہ یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ ہمارے پاس زندگی کا بہت لمبا تجربہ ہے، اور ہمارا تجربہ یہ ہے کہ تنوع اور اتحاد دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دستور ہند میں ایک دفعہ یکساں سول کوڈ کے حق میں موجود ہے۔ مگر ایک چیز محض اس لیے پسندیدہ نہیں ہو جاتی کہ وہ کسی دستور میں لکھی ہوئی ہے۔ بہر حال ہمارا دستور کچھ بیرونی دستوروں کا منسوب ہے۔ اس کو ہندوستانی تجربات کی روشنی میں نہیں بنایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان یکساں سول کوڈ کے مخالف ہیں، کیوں کہ وہ اپنا علیحدہ تشخص باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی بھی طبقہ یا فرقہ جو اپنا الگ تشخص چاہتا ہو اس سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، جب تک یہ تشخص حب وطن کے جذبات کو گھٹانے والا نہ ہو۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساسات ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو اپنے طریق زندگی پر رہنے کا پورا حق ہے، البتہ انھیں ملک سے اور اس کے کلچر سے محبت کرنا چاہیے۔ ہندوؤں کے لیے بھی یکساں سول قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ آخر ہزاروں سال سے ہندو اس قسم کے فرق کے باوجود مل جل کر رہے ہیں۔

کسی کو یہ بات فلسفیانہ معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یکسانیت قوموں کے لیے موت کی نشانی ہے۔ فطرت یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک ہر طریق زندگی کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ البتہ ان تمام تنوعات کو قومی اتحاد میں مددگار ہونا چاہیے۔

Q. Don't you think that Muslims are opposing a uniform civil code only because they want to maintain their separate identity?

A. I have no quarrel with any class, community or sect wanting to maintain its identity, so long as that identity does not detract from its patriotic feeling. I have a feeling that some people want a uniform civil code because they think that the right to marry four wives is causing a disproportionate increase in the Muslim population. I am afraid this is a negative approach to the problem.

The real trouble is that there is no feeling of brotherliness between Hindus and Muslims. Even the secularists treat the Muslims as a thing apart. Of course their method is to flatter them for their bloc votes. Others also look upon them as a thing apart, but they would like to flatten out the Muslims by removing their separate identity. Basically there is no difference between the flatterers and the flatteners. They both look upon Muslims as separate and incompatible.

My approach is entirely different. The Muslim is welcome to his way of life so long as he loves this country and its culture. I must say the politicians are responsible for spoiling the Muslims. It was the Congress which revived the Muslim League in Kerala and thus caused the increase of Muslim communalism throughout the country.

Q. If we carry this argument backwards, even the codification of the Hindu law would be considered unnecessary and undesirable.

A. I certainly consider the codification of Hindu law as altogether unnecessary for national unity and national integration. Throughout the ages we had countless codes—and we were not any the worse for them. Till recently Kerala had the matriarchal system. What was wrong with that? All law-givers, ancient and modern, are agreed the custom does, and must, prevail over the law.

“Custom is more effective than shastras”, say the shastras. And custom is the local or group code. All societies recognise the validity of the local custom or code.

Q. If a uniform civil law is not necessary, why is a uniform criminal law necessary?

A. There is a difference between the two. The civil law concerns mainly the individual and his family. The criminal law deals with the law and order and thousand other things. It concerns not only the individual but also the society at large.

Q. Would it really be correct to allow our Muslim sisters to remain in purdah and be subjected to polygamy?

A. If your objection to Muslim practices is on humanitarian grounds, then that becomes a valid objection. A reformist's attitude in these matters is allright. But a mechanical leveller's attitude would not be correct. Let the Muslims evolve their old laws. I will be happy when they arrive at the conclusion that polygamy is not good for them, but I would not like to force my view on them.

Q. This seems to be a deep philosophical question.

A. It very much is. I think uniformity is the death-knell of nations. Nature abhors uniformity. I am all for the protection of various ways of life. However, all this variety must supplement the unity of the nation and not range itself against it.

(Reproduced from *Manthan*, New Delhi, July 1986)

Golwalkar on Uniform Civil Law

On August 20, 1972, Shri Guruji, Sarsanghachalak, RSS, inaugurated the Deendayal Research Institute in Delhi. On this occasion he said that a uniform civil code was not necessary for national unity. *The Motherland* of New Delhi carried the following report on August 21, 1970

New Delhi, August 20—Shri M.S. Golwalkar, Sarsanghachalak of Rashtriya Swayamsevak Sangh, said here today that the present-day Indian politicians lacked original thinking on the problems of Indian society.

Shri Guruji was speaking at the inauguration of the Deendayal Research Institute and the celebration of Sri Aurobindo Centenary by the Institute. Shri R.R. Diwakar, President, Gandhi Peace Foundation, presided. A huge elite audience attended the function in front of the Institute building on Rani Jhansi Road, Jhandewala.

Citing the example of politicians' efforts to solve problems without thinking, he referred to the question of uniform civil code for all in the country, and said that such a uniformity was not necessary in itself; Indian culture permitted diversity in unity. 'The important thing is to infuse a spirit of intense patriotism and brotherhood among all citizens, Hindu and non-Hindu, and make them love this motherland according to their own religion.

In a special interview with *Organiser*, Shri Guruji reiterated his above view. Here is the substance of the conversation, as published in that paper's issue of August 26, 1972:

Q. You don't think that a uniform civil code is necessary for promoting the feeling of Nationalism?

A. I don't. This might surprise you or many others. But this is my opinion. I must speak the truth as I see it.

Q. Don't you think that uniformity within the nation would promote national unity?

A. Not necessarily. India has always had infinite variety. And yet, for long stretches of time, we were a very strong and united nation. For unity, we need harmony, not uniformity.

Q. In the West the rise of nationalism has coincided with unification of laws and forging of other uniformities.

A. Don't forget that Europe is a very young continent with a very young civilisation. It did not exist yesterday and it may not be there tomorrow. My feeling is that nature abhors excessive uniformity. It is too early to say what these uniformities will do to Western civilisation in times to come. Apart from the here and the now, we must look back into the distant past and also look forward to the remote future. Many actions have long-delayed and indirect consequences. We in this country have millennia of experience. We have a tested way of life. And our experience is that variety and unity can, and do, go together.

Q. A Directive Principle of State Policy in our Constitution says that the State would strive for a uniform civil code.

A. That is all right. Not that I have any objection to a uniform civil code, but a thing does not become desirable just because it is in a Constitution. In any case our Constitution is a hotch-potch of some foreign constitutions. It has not been conceived and drafted in the light of Indian experience.

فطرت کا نظام

ذوق دہلوی (۱۸۵۴-۱۶۸۹) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیبِ اختلاف سے
یہ فطرت کا قانون ہے۔ آپ کسی باغ میں کھڑے ہوں تو وہاں ہر پودے اور ہر پتھر کا انداز
جدا ہوگا۔ ہر درخت کا پھول الگ الگ رنگ میں اپنی بہار دکھا رہا ہوگا، پورا باغ تنوعات کا ایک
مجموعہ نظر آئے گا۔ حتیٰ کہ چڑیاں بھی الگ الگ آوازوں میں اپنے نغمے سنار ہی ہوں گی۔ وہ کہہ رہی
ہوں گی کہ خالق کو ایسا باغ پسند ہے جہاں کوئل کی کوک ہو تو بلبل کے چہچہے بھی ہوں۔ کوئی چڑیا ایک
ڈھنگ کی آواز نکالے تو دوسری چڑیا کسی اور ڈھنگ سے فضا میں اپنے گیت بکھرے ہر چیز
تنوع کا ایک نیا نمونہ ہو۔

یہ تنوع اس کائنات کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح انسان میں بھی۔ حیاتیات اور
نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ نہ صرف انگوٹھے کے
نشانات بلکہ ہر آدمی کے سیل دوسرے آدمی کے سیل سے جدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کی آنکھ دوسرے
آدمی کی آنکھ سے نہیں ملتی۔ یہ اختلاف و تنوع صرف ظاہری حسن کے لیے نہیں ہے۔ اس کے اندر
زبردست حکمت چھپی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی تنوع اور اختلاف سے تمام انسانی ترقیاں وابستہ ہیں۔
اسی سے نئی نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ اسی سے افکار کا تصادم ہوتا ہے جو آخر کار فکری ارتقاء کا ذریعہ
بنتا ہے۔ اسی سے باہمی چیلنج پیش آتے ہیں جو انسان کی ذہنی بیداری کے لیے ہمیز کا کام کرتے ہیں۔

کسی مجلس میں تمام شرکار کی رائے ایک ہو تو اس سے کوئی نیا آئیڈیا برآمد نہیں ہوگا۔ کسی صنعتی نظام میں
اگر تمام انجینیر ایک ہی مولڈ میں ڈھلے ہوئے ہوں تو وہ کسی نئی ٹیکنالوجی تک نہیں پہنچ سکتے۔ کسی سماج میں اگر تمام
اہل قلم یکساں ذوق کے مالک ہوں تو وہ کوئی تخلیقی ادب ظہور میں نہیں لاسکتے۔ کسی ملک کے سیاست داں اگر
سب کے سب ایک ہی سانچے میں ڈھل کر نکلے ہوں تو وہ کوئی بڑا سیاسی کارنامہ نہیں دکھا سکتے۔

تنوع اور اختلاف اس دنیا کا نام قانون ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں خود اپنے زور پر جاری و
ساری ہے۔ کوئی انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی طاقت کے زور پر اس نظام کو بدلے تو
فطرت کا طوفان اس مصنوعی نظام کو توڑ کر دوبارہ اس کو تنوع کے اصول پر قائم کر دے گا۔

قابل عمل نہیں

حقیقت یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ ایک ناقابل عمل خواب ہے، اس کا داخلی ثبوت خود دستور ہند کے اندر موجود ہے۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو دستور کی دفعہ ۳۴ اور ۲۴۱-۱ سے کے تقابل کے ذریعہ سامنے آتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دستور کی دفعہ ۳۴ میں مقرر کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کے لیے بلا استثناء ایک ہی یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے۔ مگر اسی دستور کی تریسویں دفعہ ۲۴۱-۱ سے کہی گئی ہے کہ ناگالینڈ میں ناگاؤں کے درمیان جو مذہبی اور سماجی قاعدے رائج ہیں اور ان کے یہاں جو مختلف روایتی قوانین ہیں، ان کے بارہ میں پارلیمنٹ کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ ریاست ناگالینڈ میں وہ بدستور قابل نفاذ رہیں گے۔ الایر کہ خود ناگالینڈ کی اسمبلی ان کے بارہ میں ایک تجویز کے ذریعہ ایسا طے کرے :

No Act of Parliament in respect of (Naga customary laws) shall apply to State of Nagaland unless the Legislative Assembly of Nagaland by a resolution so decides (371-A).

ظاہر ہے کہ ان دونوں دفعات میں تضاد ہے۔ یہ تضاد اسی لیے ہے کہ ہمارے دستور سازوں نے بزرگ خود جامع دستور بنانے کے لیے محض تخیل کے زور پر اس میں مختلف چیزیں اکٹھا کر دیں جو حقیقت کی دنیا میں کبھی اکٹھا ہونے والی نہ تھیں۔ غالباً اسی لیے دستور ساز اسمبلی کے ایک سینئر ممبر سر الادی کرشنا سوامی آرنے دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل کا قانون ساز ادارہ ہو سکتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سرے سے اس کی کوشش ہی نہ کرے :

The future Legislatures may attempt a uniform civil code or they may not. (Sir Alladi Krishnaswami Ayyar)

قانون کی محدودیت

قانون کوئی بالاتر چیز نہیں۔ دوسری تمام انسانی چیزوں کی طرح انسانی قانون بھی ایک محدود چیز ہے۔ ایک حد کے بعد انسانی سماج پر اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۵ میں الہ آباد ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ اس میں اندرا گاندھی کے انتخاب کو نہ صرف رد کیا گیا تھا بلکہ اندرا گاندھی کو چھ سال تک انتخاب میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا

گیا تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ اندرا گاندھی نے امیر جنسی کا اعلان کر کے مزید اضافہ کے ساتھ دہلی کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۸۶ میں یوپی کی ایک عدالت نے اپنے فیصلہ کے تحت بابر مسجد کا بندروازہ کھلوا دیا تاکہ ہندو آسانی کے ساتھ اس کے اندر پوجا کی رسم ادا کر سکیں۔ بظاہر اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوش گوار تعلق قائم کرنا تھا۔ مگر اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ایسا طوفان برپا ہوا کہ ہندو مسلم تعلقات آخری حد تک بگڑ گئے اور ہندستان سیاسی اور اقتصادی تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔

شاہ بانو کیس میں ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ بظاہر اس کا مقصد عورتوں کے ساتھ انصاف کرنا تھا، مگر عملی نتیجہ یہ ہوا کہ راجیو گاندھی گورنمنٹ نے ایک قانون بنا کر سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو کالعدم کر دیا۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس معاملہ کو بھرپور طور پر اپنے سیاسی فائدہ کے لیے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ہندستان پارلیمنٹ میں اس کے ممبروں کی تعداد دو سے بڑھ کر ۱۱۹ تک پہنچ گئی اور کئی ریاستوں میں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

قانون کی محدودیت اس سے بھی ثابت ہے کہ ہندو کو ڈبل ۱۹۵۵ میں اگرچہ کسی ہندو کے لیے صرف ایک ہی نکاح کی اجازت رکھی گئی ہے۔ مگر ۱۹۶۱ کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی شرح ہندوؤں کے اندر مسلمانوں سے زیادہ ہے :

According to the Indian census report of 1961, the percentage of Hindus having more than one wife was more than that of the Muslims.

انگریزوں نے ہندستان میں اپنے دو سو سالہ اقتدار کے زمانہ میں صرف پانچ سو قانون بنائے۔ ہمارے لیڈروں کو ملک میں ۱۹۴۷ میں اقتدار ملا تو انہوں نے ۴۵ سال کی مدت میں پانچ ہزار سے زیادہ قانون بنا ڈالے۔ مگر اصلاحی قوانین کی کثرت صرف الٹا نتیجہ دینے والی (counter-productive) ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ملک میں جھگڑے بہت بڑھ گئے۔ کرپشن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ انصاف حاصل کرنا انتہائی دشوار کام بن گیا۔ عورتوں کی حالت ہمیشہ سے زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ حالات سماج سدھار کے لیے نئی تدبیر تلاش کرنے کا تقاضا کرتے ہیں نہ کہ قوانین میں مزید اضافے کا۔

تبدیلی مذہب کا مسئلہ

سپریم کورٹ کی ڈویژن پنچ کے سامنے جو پیشین تھا اس کا براہ راست کوئی تعلق یونیفارم سول کوڈ سے نہیں تھا۔ یہ پیشین دراصل چار ہندو خواتین کی طرف سے عورتوں کی ایک تنظیم کلیانی (Kalyani) نے دائر کیا تھا۔ اس تنظیم کی پریسیڈنٹ شریستی سرلامگل ہیں۔ ان چار ہندو عورتوں نے کہا تھا کہ ہمارے شوہروں نے اسلام قبول کر کے دوسرا نکاح کر لیا ہے، جب کہ انھوں نے ہمیں طلاق نہیں دی۔ ان کا قبول اسلام صرف اس لیے تھا کہ وہ اسلام کے قانون نکاح سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دوسری بیوی حاصل کر سکیں۔ اس لیے عدالت ان کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے کر ہماری مدد کرے۔

عدالت نے مذکورہ پیشین کو منظور کرتے ہوئے چاروں ہندوؤں کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور ان کو ان کی پہلی بیوی کی طرف واپس لوٹا دیا۔ یہ فیصلہ دیتے ہوئے جسٹس کلڈیپ سنگھ لکھتے ہیں :

جب تک ہم اصل منزل تک نہ پہنچیں، یعنی ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یونیفارم سول کوڈ، اس وقت تک یہاں ہندو شوہر کے لیے ایک کھلا محرک (inducement) باقی رہے گا جو کہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہو۔ جب کہ اس کی پہلی بیوی ابھی موجود ہو، ایسا ہندو اپنے مسلم ہونے کا اعلان کر کے دوسری شادی کر لے گا۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے یک زوجگی کا قانون ہے، اور مسلم قانون چار شادیوں تک کی اجازت دیتا ہے، کوئی کچھ رو ہندو شوہر ایسا کر سکتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے تاکہ ہندو لاکہ ضوابط سے بچ سکے اور دوسری شادی کے باوجود فوجداری قانون کی پکڑ میں نہ آئے۔ (صفحہ ۵)

اسی نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہوئے دی ہندستان ٹائمس ۲۱ جون ۱۹۹۵ میں لیٹرس کے کالم میں مسٹر چین لال ورمانے لکھا تھا کہ کیساں سول کوڈ کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان لوگوں کو مذہب کے غلط استعمال سے روکا جاسکے جو ایک قانون کی دفعات سے بچنے کے لیے دوسرے قانون کی دفعات کا ہمارا لیتے ہیں :

A uniform civil code is required to prevent the misuse of religion to evade the provisions of one law to take advantage of those of another.

نیا قانون بنا کسی بھی درجہ میں پچھلے قانون کے غلط استعمال کے خلاف چیک نہیں۔ قانون کے غلط استعمال کا موقع ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ ٹیکس ماری کو روکنے کے لیے بے شمار قوانین اور ضوابط بنے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ٹیکس ماری کا سلسلہ ہالیائی سطح پر جاری ہے۔ پھر جب کسی بھی قانون میں اس کے غلط استعمال کو روکنا ممکن نہ ہو سکا تو سول کوڈ میں کیونکر ایسا ممکن ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ یونیفارم سول قانون کے نفاذ کے بغیر اگر ایسے ہندوؤں کے لیے کوئی قانونی چیک نہیں ہے تو سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحبان کے لیے کیوں کر ایسا ممکن ہو گا کہ وہ ایسے غلط ہندوؤں کے لیے سزا کا فیصلہ سنائیں اور ان کے دوسرے نکاح کو باطل (invalid) قرار دے دیں۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے جج صاحبان نے اپنا مقصد انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۴۹ کے ذریعہ حاصل کیا۔ گویا عدالت کی خود اپنی مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بالفعل ایسے مانع قوانین موجود ہیں۔ اور کچھ روہندو کے لیے یہاں کوئی بے قید محرک پایا نہیں جاتا، حتیٰ کہ موجودہ قوانین کے تحت بھی نہیں۔ پھر ایسے کچھ روہندوؤں کو کچھ روئے سے روکنے کے لیے کسی نئے سول قانون کی کیا ضرورت :

The Court's own ruling shows that no such inducement is available to an "errant Hindu" even under existing law. You do not need a civil code to deter him.

دفعہ ۴۴ قابل حذف

اوپر میں نے جو تجزیہ کیا ہے اور جو دلائل جمع کیے ہیں، اس کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کی کوئی بھی قانونی یا اخلاقی یا سماجی معنویت نہیں۔ وہ کچھ دماغوں کا ایک فرضی تخیل تھا۔ اب اس کا واحد انجام یہ ہونا چاہیے کہ اس کو دستور سے حذف کر دیا جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح جسم کی فاضل آنت (Appendix) کا آپریشن کر کے اسے نکال دیا جاتا ہے۔

اس قسم کا دستوری آپریشن کوئی نئی چیز نہیں۔ دستور ہند میں بار بار ایسے حذف و اضافے کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدائی دستور میں انفرادی ملکیت کو مکمل طور پر محترم قرار دیا گیا تھا اور حکومت کو دستوری طور پر یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ کسی کی جائز ملکیت کو اس سے چھین سکے۔ مگر ۱۹۵۵ء میں دستور میں چوتھا ترمیمی ایکٹ (The Constitution (Fourth Amendment) Act 1955)

منظور کیا گیا جس کی رو سے اسٹیٹ کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ کسی بھی شخص کی نجی ملکیت کو جبراً اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس ایکٹ کی رو سے مالک جائیداد کو اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا کہ سرکاری معاوضہ اگر اس کو مارکٹ کی شرح سے کم معلوم ہو تو وہ عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کر سکے۔

اسی طرح ابتدائی دستور میں سابق راجاؤں کو صرف خاص (privy purses) کا حق دیا گیا تھا مگر ۱۹۷۱ میں دستور میں ۲۶ ویں ترمیم کی گئی جس کی رو سے اس دفعہ کا خاتمہ کر دیا گیا اور صرف خاص کے سلسلہ میں ان کو دیے ہوئے تمام دستوری حقوق کو یکسر ساقط کر دیا گیا۔ وغیرہ۔

ان نظائر کی روشنی میں یہ بات کسی بھی درجہ میں انوکھی نہیں ہے کہ ایک اور ترمیم کے ذریعہ دستور ہند کی دفعہ ۳۴ کو کامل طور پر حذف کر دیا جائے۔ اس کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوگا۔ البتہ ہمارا دستور ایک ایسے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا جو غیر ضروری طور پر اس کے اوپر لا دیا گیا تھا۔

یونی کلچریشن یا ملٹی کلچریشن

ہندستان میں پچھلے سو سال سے دو مختلف سیاسی گروپ موجود رہے ہیں اور آج بھی وہ الگ الگ ناموں کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک وہ جو سیکولر آئیڈیالوجی پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا وہ جو ہندو آئیڈیالوجی پر ہندستانی سماج کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہندستان میں تمام لوگوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنایا جانا چاہیے۔

لیکن اگر غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھا جائے تو یونیفارم سول کوڈ دونوں ہی کے نظریات کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنے نظریہ میں مخلص ہوں تو ہرگز انھیں اس قسم کے تصور کی حمایت نہیں کرنا چاہیے۔

سیکولرزم کا مطلب ہے — مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ کا عدم مداخلت (non-interference) کی پالیسی اختیار کرنا۔ لوگوں کو اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی دیتے ہوئے صرف مشترک دنیوی امور کا انتظام و انصرام کرنا۔ یہی سیکولرزم کا عالمی سطح پر متفقہ مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے مطابق دستور ہند کی تشکیل کی گئی ہے۔

کچھ لوگ سیکولرزم کی تشریح اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ خود ایک مذہب ہے اور تمام مروجہ مذاہب کو ختم کر کے نجی دائرہ سے لے کر اجتماعی دائرہ تک زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دائرے میں لینا چاہتا ہے۔

مگر یہ انتہا پسندی ہے۔ اس قسم کے انتہا پسند لوگ ہر مذہب اور ہر نظام میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ خود اسلام میں ایسے انتہا پسند لوگ موجود ہیں جو اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس میں اسلام سیاست اور جنگ کا مذہب بن جاتا ہے۔ مگر یہ غلو اور تشدد ہے، وہ اسلام کی صحیح نمایندگی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیکولرزم اور یونیفارم سول کوڈ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہندستان کا سیکولر گروپ اگر واقعہً سیکولر گروپ ہے تو اس کو یونیفارم سول کوڈ کی بات نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ افرادی دائرہ میں مذہبی آزادی سیکولرزم کا بنیادی اصول ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندو آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اس گروہ کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ ہندو آئیڈیالوجی میں عقیدہ رکھتا ہے تو یہ خود اس کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ وہ ہر طبقہ اور فرقہ کو ایک ہی سول کوڈ کے تحت لانے کی کوشش کرے۔

ہندو آئیڈیالوجی کا بنیادی اصول سرودھرم سمبھاوا ہے۔ یعنی سب دھرم سچے ہیں۔ ہندو ازم کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ کثرت میں وحدت (unity in diversity) کو مانتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کے ظاہری فارم مختلف ہوتے ہیں مگر اندرونی حقیقت ایک ہوتی ہے۔ گویا ہندو ازم کا عقیدہ ہے — ایکتا میں ایکتا کو دیکھنا۔

سول کوڈ یا کسی بھی کوڈ کا تعلق ظاہری فارم سے ہے نہ کہ اندرونی اسپرٹ سے۔ اسی حالت میں یہ ہندو نقطہ نظر کے خلاف ہوگا کہ مختلف گروپوں کے پرسنل لا کو ختم کر کے سب کے لیے صرف ایک کوڈ جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک (مثلاً برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ) میں ملٹی کلچر نیشن کا اصول رائج ہے۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملک سے لے کر امریکہ جیسے بڑے ملک تک ہر جگہ اسی اصول کو اختیار کر کے ترقی ہو رہی ہے۔ سوویت یونین غالباً واحد ملک ہے جہاں یونی کلچر نیشن بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے ہر قسم کی ریاستی طاقت استعمال کی گئی۔ مگر یونی کلچر نیشن تو نہیں بنی، البتہ خود سوویت یونین ٹوٹ کر ختم ہو گیا۔ تاریخ عالم کے یہ تجربات ہماری آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یکسانیت کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ قانون سے۔ اگر کسی سماج میں تاریخی عمل کے ذریعہ یکساں کلچر آجائے تو وہاں یکساں کوڈ بھی بن جائے گا۔ اس سے پہلے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اضافہ آبادی کا ہوا

متعدد سینئر شہریوں نے یہ بات کہی ہے کہ شادی بیاہ کا معاملہ انتہائی نجی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کمیونٹی چاہتی ہے کہ اس نجی معاملہ میں وہ اپنے روایتی طریقہ پر قائم رہے تو اس میں دوسری کمیونٹی والوں کو اجازت کرنے کی کیا ضرورت۔ اس واضح نامعقولیت کے باوجود کچھ انتہا پسند پولیٹیکل عناصر کیوں یونیفارم سول کوڈ لانے کے لیے اتنا زیادہ شور و غل کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ آنے والے لوگ بھالکشن میں ان کا اصل انتخابی ایشو (main poll theme) یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ ہوگا (دی ہندستان ٹائمز، ۱۷ جولائی ۱۹۹۵ء) جب کہ یقینی طور پر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یونیفارم سول کوڈ کی بنیاد پر قانون بنانے کا عملاً کوئی امکان نہیں۔ اس جوش و خروش کا سبب خود یونیفارم سول کوڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نام پر سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ عناصر انتہائی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ غلط پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اگلی صدی کے نصف اول میں یہ واقعہ ہونے والا ہے کہ مسلمان یہاں اکثریت میں ہو جائیں اور ہندو خود اپنے ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں۔

اس بے بنیاد پروپگنڈے کے لیے انھوں نے ایک پرفریب نظریہ وضع کیا ہے۔ وہ اکثریتی فرقہ کے عوام سے کہتے ہیں کہ دیکھو، آزادی کے بعد بننے والی گورنمنٹ نے ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ء کے ذریعہ ہندوؤں کو تو قانونی طور پر پابند کر دیا کہ وہ صرف ایک بیوی رکھ سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا جو پرسنل لاء ایکٹ (۱۸۶۰ء) ہے، اس کے تحت ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ چار بیویاں رکھے۔ ہندو کے اوپر پابندی لگی ہوئی ہے، مگر مسلمان کے اوپر کوئی پابندی نہیں۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو کے مقابلہ میں مسلمان چار گنا زیادہ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس ملک میں ہندوؤں کی آبادی اگر ۱-۲-۳-۴-۵ کی رفتار سے بڑھے گی تو مسلمانوں کی تعداد ۱-۴-۸-۱۶-۳۲ کی رفتار سے بڑھتی چلی جائے گی۔ اپنے سیاسی حریف کی اس طرح بھیانک تصویر دکھا کر یہ لوگ ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا رہے ہیں۔ وہ ہندو عوام سے کہہ رہے ہیں کہ اس ہندو ورو دھی سرکار کے خلاف ووٹ دے کر اس کو باہر پھینک دو :

Throw out this anit-Hindu government.

یہ پروپگنڈا بلاشبہ آخری حد تک بے بنیاد ہے۔ مسلمان عام طور پر ایک ہی شادی کرتے ہیں۔ میری

عمر ۷۳ سال ہو چکی ہے۔ مگر اس پوری مدت میں میرے علم میں کوئی ایک بھی ہندستانی مسلمان نہیں آیا جس نے چار شادیاں کر رکھی ہوں۔ حتیٰ کہ ایسا کرنا ممکن بھی نہیں۔ کیوں کہ تمام مسلمان چار شادیاں اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ان کے یہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد چار گنا زیادہ ہو۔ یا ان کے پاس کوئی ایسا کارخانہ ہو جہاں وہ زیادہ عورتیں پیدا کر سکیں۔ مگر موجودہ مسلم سماج میں نہ تو عورتیں زیادہ ہیں اور نہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔ ایسی حالت میں ان کے لیے کیوں کر ممکن ہو گا کہ ان میں سے ہر شخص چار چار بیویاں رکھے۔ مگر بلراج پوری کا ایک پیراگراف اس سلسلہ میں نقل کرنے کے قابل ہے :

”اس خدشہ کا پہلا مقدمہ کہ تعدد ازواج کے حق میں قانونی دفعہ اس پر عمل تک بھی پہنچائے گی، شمار یاتی مطالعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ عورت کی حیثیت کے بارہ میں نیشنل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق، تعدد ازواج فی الحقیقت دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اندر کم ہے۔ اس کا دوسرا مقدمہ کہ تعدد ازواج مسلمانوں کی آبادی کو زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھانے کا منطقی طور پر مغالطہ آمیز ہے۔ بچہ پیدا کرنے کے قابل عورتوں کی تعداد چونکہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اگر کچھ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو بہت سے مردوں کو بیویاں ہی نہیں ملیں گی۔ کسی فرقہ میں غیر شادی شدہ مردوں کی کثیر تعداد کسی بھی طرح اس فرقہ کی تولیدی صلاحیت میں اضافہ نہیں کرتی۔ واضح طور پر، چار آدمی چار بیویوں کے ساتھ زیادہ بچے پیدا کریں گے، بمقابلہ اس کے کہ ایک ہی مرد کے ساتھ چار بیویاں ہوں۔ اس طرح تعدد ازواج کا طریقہ آبادی میں اضافہ کی رفتار کو گھٹانے والا ہے نہ کہ اس کو بڑھانے والا (انڈین ایکسپرس ۶ جولائی ۱۹۹۵)“

تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ انتہا پسند سیاسی عناصر اگلے الیکشن میں ہندو ووٹروں سے کہیں گے کہ دیکھو، دستور کی دفعہ اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے باوجود مسلمان یکساں سول کوڈ بنانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ وہ ایسا قانون بنانے کے مخالف اس لیے ہیں کہ اس کے بعد انھیں چار شادیوں کی اجازت نہیں رہے گی اور اس طرح وہ اپنی آبادی بڑھانے اور ہندوؤں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کر سکیں گے۔ اس لیے ہمیں ووٹ دے کر ہم کو اقتدار تک پہنچاؤ تاکہ ہم اس خطرہ کا دفعیہ کر سکیں۔ مگر اس پروپنڈے کا بے بنیاد ہونا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب نہ ہو۔ بلکہ اس سب سے بڑا اخبار ٹائمز آف انڈیا ہر روز اپنے

پہلے صفحہ پر اس قانون فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ سچائی غالب آتی ہے (Let Truth Prevail)

مساوات نہیں ایڈجسٹمنٹ

۱۹۵۴ میں ہندوستانی پارلیمنٹ نے اسپیشل میریج ایکٹ منظور کیا تھا۔ اس کے مطابق، مرد اور عورت کسی مذہبی رسم کی ادائیگی کے بغیر مخصوص کورٹ میں جاتے ہیں اور ایک مجسٹریٹ کے سامنے اقرار کر کے ایک دوسرے کے قانونی میاں اور بیوی بن جاتے ہیں۔ کامن سول کوڈ اگر سیکولر اصول پر بنایا جائے تو وہ موجودہ اسپیشل میریج ایکٹ ہی کی ایک توسیع ہوگی۔ میں نے دہلی میں تحقیق کی کہ یہاں کتنے لوگ ہیں جنہوں نے مذکورہ ایکٹ کے تحت اپنی شادی کی ہے۔ کافی تلاش و تحقیق کے بعد مجھے صرف دو آدمی ملے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ یہ دونوں کسی مذہبی رسم کے بغیر سادہ طور پر کورٹ میں گئے اور وہاں اپنا نکاح رجسٹر کروایا۔ مگر چند ہی سال کے بعد دونوں شادیاں ٹوٹ گئیں اور اب مرد و عورت دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ میں نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس علحدگی کا سبب "ایگوازیم" تھا۔ دونوں میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر تکرار ہو جاتی۔ یہ تکرار بڑھتے بڑھتے مستقل علحدگی تک پہنچ گئی۔

مساوات مرد و زن کا جدید نظریہ کاغذ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر زندگی میں سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ ایڈجسٹمنٹ ہے نہ کہ مساوات۔ مساوات کا تصور حقوقِ ظہنی کا مزاج بناتا ہے اور ایڈجسٹمنٹ کا تصور حقوقِ ظہنی کا مزاج بناتا ہے اور دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، اور ایڈجسٹمنٹ کا ذہن رکھنے والے کامیاب گھر کی تعمیر کرتے ہیں۔

میں نے جاپان کے بارہ میں ایک کتاب پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جاپانی عورت اور مرد کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں (I am under someone) اپنے اس احساس کی بنا پر جاپانی انسان ہمیشہ فریقِ نثانی سے ایڈجسٹ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی عورت سب سے زیادہ بری بیوی ہے اور جاپانی عورت سب سے زیادہ اچھی بیوی۔ اس کا راز یہی ہے۔ امریکی عورت پر سب سے زیادہ جو خیال مسلط ہوتا ہے وہ برابری کا تصور ہے۔ اس کے برعکس جاپانی عورت برابری اور نابرابری کی بحث سے اوپر اٹھ کر صرف یہ احساس لیے ہوتی ہے کہ مجھے موافقت کے اصول پر زندگی گزارنا ہے۔ اسی لیے ازدواجی زندگی میں امریکی عورت ناکام رہتی ہے اور جاپانی عورت کامیاب — اچھا خاندان بنانے کے لیے ہمیں سب سے زیادہ ایڈجسٹمنٹ پر زور دینا ہے نہ کہ مغربی تصور کے مطابق مساوات پر۔

ہندو برادریوں کا رواج

خود ہندوؤں میں شادی بیاہ کا کوئی ایک مقرر طریقہ نہیں۔ ہندوؤں میں سیکڑوں کی تعداد میں مختلف گروہ ہیں، اور ہر گروہ اپنے اپنے خاندانی یا علاقائی رواج کے مطابق شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کرکٹ کے مشہور کھلاڑی ساچن ٹنڈولکر (Sachin Tendulkar) نے ۲۵ مئی ۱۹۹۵ کو بمبئی میں مسز انجلی ہتا سے شادی کی تو اخباری رپورٹ کے مطابق، ان کے نکاح کی تقریب ہمارا شرط کے روایتی انداز (traditional Maharashtra-style) میں ادا کی گئی (پانیر ۲۶ مئی ۱۹۹۵)

آج بھی تقریباً تمام ہندو اپنی شادیاں اپنے مذہبی رواج کے مطابق کرتے ہیں، اگرچہ اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ کی صورت میں ان کے لیے ایک عمومی قانون موجود ہے :

Almost all Hindus still solemnise their marriages through religious customs although there is a civil way out through the Special Marriages Act of 1954. (The Hindustan Times, May 22, 1995)

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ یہ دراصل وہی ہے جو ہونا چاہیے۔ شادی بیاہ کا تعلق انتہائی نجی معاملات سے ہے۔ ایسے معاملات میں ہر فرقہ ہمیشہ اپنے خاندانی یا گروہی رسم و رواج کے مطابق ہی عمل کرتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

اصل ضرورت : نیشنل کیرکٹر

انڈیا کو ایک متحد اور پر امن اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لیے اصل میں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نیشنل کیرکٹر ہے۔ ملک میں جتنی بھی کمیاں ہیں، یا جو بگاڑ بھی یہاں نظر آتا ہے۔ ان سب کا اصل سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آزادی کے بعد ملک کے لوگوں میں نیشنل کیرکٹر پیدا نہ کیا جاسکا۔ نیشنل سوچ شخصی سوچ کی ضد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ذاتی مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے قومی مفاد کو اہمیت دے۔ جہاں کہیں دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ ہو تو وہ شخصی مفاد کو پس پشت ڈالے اور قومی مفاد والے طریقہ کو اختیار کر لے۔

باہر کا کوئی ملک پیسہ دے کر آپ کو خریدنا چاہے تو اپنے ملک کی محبت آپ کو اس سے روک دے۔ ٹیکس نہ دینے میں آپ کو ذاتی فائدہ ہو رہا ہو تب بھی آپ ٹیکس دیں کیوں کہ اس سے قوم کو فائدہ

ہوگا۔ ملاوٹی چیزیں سپلائی کرنے میں آپ کا ذاتی نفع بڑھنا ہو مگر آپ ایسا نہ کریں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے۔ ذاتی شکایت کے باوجود آپ تو می اٹلاک کو نقصان نہ پہنچائیں اور اقتصادی پھیپہ کو روکنے کی کوشش نہ کریں، کیوں کہ اس میں ملک کی تباہی ہے۔ الکشن میں اگر آپ ہار جائیں تو دل سے اپنی ہار کو مان لیں۔ کیوں کہ ہار نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کا پورا سیاسی نظام بگڑ جاتا ہے۔ اگر آپ ذمہ داری کے عہدہ پر ہیں تو اپنے مالی فائدہ کے لیے سکیئنڈل اور اسکیم میں ملوث نہ ہوں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو ایک بار حکومت مل جائے تو یہ نہ چاہیں کہ میں ہی ہمیشہ حکومت کی گدی پر بیٹھا رہا ہوں۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاسی خود غرضی ملک کے جمہوری ڈھانچہ کو تباہی اور بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔ اگر آپ لیڈر ہیں تو اپنے الکشنی مفاد کے لیے ایک گروہ کے اندر دوسرے گروہ کے خلاف نفرت اور خوف کے جذبات نہ پیدا کریں۔ کیوں کہ اس سے آپ کا ووٹ بنک تو بنے گا۔ لیکن ملک کا بینک دیوالیہ ہو کر رہ جائے گا۔ وغیرہ

اسی کا نام سچی دلش بھگتی ہے۔ اور یہی ملک کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہی چیز آج ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ دلش بھگت کے بجائے خویش بھگت ہو گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے فائدہ کی خاطر ملک کے فائدہ کو بھول گیا ہے۔ اسی خویش بھگتی نے ملک کا وہ برا حال کر دیا ہے جس کی آج ہر آدمی شکایت کر رہا ہے۔

دلش بھگتی کا من سول کو ڈبلیسی ظاہری کارروائیوں سے کبھی نہیں آئے گی۔ بلکہ لوگوں کی سوچ کو تعمیری رخ دینے سے آئے گی۔ اس کے لیے ہمیں تمام ذرائع کو استعمال کر کے لوگوں کو مددجو کیٹ کرنا ہوگا۔ ہمیں تعمیر شعور یا ذہنی بیداری کی ایک طویل اور ہمہ گیر مہم چلانی ہوگی۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی دوسری چیز اس کا بدل نہیں۔

تعلیم کی اہمیت

دستور ہند کے رہنما اصولوں کے تحت جو دفعات درج ہیں ان میں سے ایک اس کی دفعہ ۵۱ ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے کہ ریاست یہ کوشش کرے گی کہ دستور کے نفاذ کے بعد دس سال کی مدت میں وہ تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کر دے، یہاں تک کہ وہ چودہ سال کی عمر تک پہنچ جائیں :

The state shall endeavour to provide, within a period of ten years from the commencement of this Constitution, for free and compulsory education for all children until they complete the age of fourteen years.

غالباً بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ دفعہ دستور کے رہنما اصولوں کے تحت درج شدہ دفعات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی یہی دفعہ سب سے زیادہ غیر اہم بنی ہوئی ہے۔ سپریم کورٹ نے کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ حکومت سے باز پرس کرے کہ دس سال کی مقرر مدت گزرنے کے باوجود اس دفعہ پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔

دستور ہند کا نفاذ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نومبر ۱۹۵۹ء میں دس سال کی یہ مقرر مدت پوری ہو گئی۔ مگر ملک کے تمام نوجوانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا نشانہ کسی بھی درجہ میں حاصل نہ ہو سکا۔

تعلیم کی اہمیت قومی تعمیر کے لیے اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کامن سول کوڈ کا معاملہ صرف ایک نان اشو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا واحد ناکافی نشانہ صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم ملک کی آبادی کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنائیں۔ اس کے سوا جس چیز کو بھی نشانہ بنایا جائے گا وہ اصل قابل لحاظ چیز سے توجہ کو ہٹانے (shift of emphasis) کے ہم معنی ہو گا۔ اور اس طرح توجہ کو اہم سے ہٹا کر غیر اہم میں الجھا دینا ایک قومی جرم ہے کہ قومی خدمت۔

تعلیم کا تعلق اصلاً سروس سے نہیں ہے۔ تعلیم کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ شعور کی تربیت کرتی ہے۔ مادی کو صحیح طرز پر سوچنے والا بنادیتی ہے۔ سماج یا قوم میں جتنے بھی مثبت اور مفید واقعات ہوتے ہیں وہ سب انہیں لوگوں کی دین ہوتے ہیں جو صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔

صحیح طرز فکر آدمی کے اندر دور اندیشی پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو بتاتا ہے کہ وہ اختلافات سے کس طرح نپٹے۔ وہ آدمی کے اندر وہ بالغ نظری پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس سے آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کو جانتا ہے۔ وہ ظاہر سے گزر کر اندرونی حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ صحیح طرز فکر سے صحیح عمل ظہور میں آتا ہے، اور صحیح عمل ہی کسی فرد یا گروہ کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

سماج میں یک جہتی اور اتحاد کی فضا بنانے کے لیے اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کا

شادی بیاہ کا طریقہ ایک ہو۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگ صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔ صحیح طرز فکر کیا ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوگا۔

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) کو ایک کرپچین بھائی نے اپنے مکان پر بلایا۔ کرپچین نے سوامی جی کو جانچنے کے لیے یہ کہا کہ اپنے ملاقات کے کمرہ میں ایک میز پر نیچے اور اوپر بہت سی مذہبی کتابیں رکھ دیں۔ سب سے نیچے ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن رکھی۔ اس کے اوپر مختلف مذہبوں کی کتابیں، اور سب سے اوپر اپنی مذہبی کتاب بائبل۔ سوامی ویویکانند جب کمرہ میں داخل ہوئے تو کرپچین میزبان نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھئے، اس کے بارہ میں آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ سوامی جی کتابوں کی مذکورہ ترتیب کو دیکھ کر مسکرائے، اور کہا: فاؤنڈیشن تو بہت اچھی ہے۔

سوامی جی اگر اس معاملہ کو وقتار (پریسٹیج) کا اثوبناتے تو وہ بگڑ جاتے۔ وہ کہتے کہ کیا تم نے مجھے ذیل کرنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔ اب دونوں میں تکرار شروع ہو جاتی۔ عین ممکن ہے کہ یہ تکرار بڑھ کر اس نوبت تک پہنچتی کہ امن قائم کرنے کے لیے پولیس کو بلانا پڑتا۔ لیکن سوامی جی نے اس کو وقار کا مسئلہ بنانے کے بجائے اس کو اعراض کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو معاملہ دونوں کو لڑائی تک پہنچاتا، وہ دونوں کے درمیان مسکراہٹ کے تبادلہ پر ختم ہو گیا۔

یہ قابل متذکرہ واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ کیا اس لیے کہ سوامی ویویکانند اور مذکورہ کرپچین کا شادی بیاہ کا طریقہ ایک تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ کیوں کہ ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا عیسائی۔ اور ہندوؤں اور عیسائیوں میں شادی بیاہ کا طریقہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سوامی ویویکانند ایک ایسے آدمی تھے جن کی اعلیٰ تعلیم نے ان کو حد درجہ باشعور بنا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح کسی واقعہ کو منفی رخ دینے کے بجائے اس کو مثبت رخ دیا جاسکتا ہے۔ وہ سوچنے کا آرٹ جانتے تھے۔ وہ زندگی کی سائنس سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح اختلاف کے باوجود اتحاد کے ساتھ رہا جاسکتا ہے۔ اس کا راز سوامی جی کی شعوری بیداری تھا کہ کسی قسم کا مشترک سول کوڈ۔

مسلمانوں سے خطاب

آخر میں مسلمانوں سے میں گزارش کروں گا کہ وہ سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلہ (۱۹۹۵) کے معاملہ میں ماضی کی اس غلطی کو ہرگز نہ دہرائیں جو سپریم کورٹ کے سابق فیصلہ (۱۹۸۵) کے معاملہ میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ دس سال پہلے جب شاہ بانو کیس پر عدالت عالیہ کا فیصلہ سامنے آیا تو مسلمانوں نے سارے ملک میں احتجاج اور مظاہرہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا براہ راست فائدہ ملک کے انتہا پسند ہندو عناصر کو پہنچا۔

اب دوبارہ یہ عناصر انتظار کر رہے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر سڑکوں پر آجائیں، تاکہ وہ مسلم خطرہ کا ہوا کھڑا کر کے ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا سکیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ اپنی موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ اگر مسلمانوں نے دوبارہ مظاہراتی طریقے اختیار کیے تو یقینی طور پر وہ ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔

یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی جگہ ہے۔ یہاں ہر ایک اس انتظار میں رہتا ہے کہ وہ دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ فریق ثانی کو یہ موقع ہمیشہ اس وقت ملتا ہے جب کہ ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آپ بھرک اٹھیں اور عاجلانہ اقدام کر بیٹھیں۔ اسی لیے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ — تم صبر کرو، جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (الاحقاف ۳۵) صبر کا طریقہ فریق ثانی سے یہ موقع چھین لیتا ہے کہ وہ آپ کی کمزوریوں کا استحصال کر سکے۔ جب کہ بے صبری کا طریقہ آپ سے ایسی غلطیاں کراتا ہے کہ آپ نہایت آسانی سے فریق ثانی کے سازشی منصوبوں کا شکار ہو جائیں۔

کسی فریق کے خلاف سازش اگرچہ دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ مگر عملاً سازش کا شکار ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ خود فریق کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھنے میں زیر سازش گروہ کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

انڈیا	انوارِ محنت	روشن مستقبل	تذکرہ القرآن مجسٹ
تذکرہ پھر آن جلد اول	تعمیرِ وطن	صوم بھٹان	تکرات، ترجمہ و تفسیر
تذکرہ پھر آن جلد دوم	جسٹس کی تحریک	عسلم کلام	A-14 سترق سوئیس ۱
اشا کبیر	تعبید بیرون	صدائے اسلام	A-15 سترق سوئیس ۲
پیغمبر انقلاب	فضیلت اسلام	علم اور دوزخ جہنم	A-16 سترق سوئیس ۳
نذیب اور جدید مسیح	نذیب اور مائیس	بند ستانی مسلمان	ویڈیو کیسٹ
عظمتِ قرآن	قرآن کا مطلوب انسان	سیرتِ رسول	V-1 پیغمبر انقلاب
عظمتِ اسلام	دین کی اہمیت	بسمہ بریک پیغمبر پرورد	V-2 اسلام برائے امن
عظمتِ صحابہ	اسلام دینِ فطرت	بہنستانِ آزادی کے بند	V-3 اسلام دوزخ جہنم کا خانقہ
دینِ کامل	تعمیرِ ملت	ماگنوم تاریخ جس کو درگاہِ کعبہ	V-4 اہمیت اسلام اور جدید مسیح
الاسلام	تاریخ کا سبق	سوشلزم ایک فوہاسدی نظریہ	V-5 اسلام اور سماجی انصاف
ظہورِ اسلام	فسادات کا مسئلہ	سداوتِ کائنات	V-6 اسلام اور دوزخ جہنم
اسلامی زندگی	انسان اپنے آپ کو پہچان	مسندی	God Arises
احیاءِ اسلام	تعارفِ اسلام	سچائی کی تلاش	Muhammad
رازِ حیات	اسلام پندرہویں صدی میں	انسان اپنے آپ کو پہچان	The Prophet of Revolution
صراطِ مستقیم	راہیں بند نہیں	پیغمبرِ مہم	Islam As It Is
خاتونِ اسلام	ایمانِ طاقت	مزلوں کی اور	God Oriented Life
سوشلزم اور اسلام	اتحادِ ملت	عسومی	Words of the Prophet
اسلام اور عصرِ حاضر	سبق آموز واقعات	الاسلام بے متحدی	Introducing Islam
الربانیہ	زلزلہ قیامت	الاسلام	Religion and Science
کاروانِ ملت	حقیقت کی تلاش	والصوت وحدت	Tabligh Movement
حقیقتِ حج	پیغمبرِ اسلام	آڈیو کیسٹ	Islam the Voice of Human Nature
اسلامی تعلیمات	آخری سفر	A-1 حقیقتِ ایمان	Islam the Creator of Modern Age
اسلام دوزخ جہنم کا خانقہ	اسلامی دعوت	A-2 حقیقتِ نماز	The Way to Find God
حدیثِ رسول	نہا اور انسان	A-3 حقیقتِ روزہ	The Teachings of Islam
ڈائری جلد اول	حل یہاں ہے	A-4 حقیقتِ زکوٰۃ	The Good Life
ڈائری جلد دوم	سچا راستہ	A-5 حقیقتِ حج	The Garden of Paradise
سفر نامہ (ملکی سفر)	دینی تعلیم	A-6 سنتِ رسول	The Fire of Hell
سفر نامہ (غیر ملکی سفر)	حیاتِ طیبہ	A-7 سیدانِ مہل	Man Know Thyself!
میوات کا سفر	باغِ جنت	A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	Muhammad The Ideal Character
قیادت نامہ	تاریخِ ہند	A-9 اسلامی دعوت	Social Justice in Islam
راہِ عمل	نیلج ڈائری	A-10 اسلامی اخلاق	Polygam
تعمیر کی عقلی	رہنمائے حیات	A-11 اتحادِ ملت	Words of Wisdom
دین کی مہیا کی تعمیر	شخصیاتِ اسلام	A-12 تعمیرِ ملت	فائل الرسائل اردو (مجلد)
اقوالِ محنت	تعددِ ازدواج	A-13 نصیحتِ قرآن	سال 1982 80/-

MAKTABA AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi-110 013

Rs.5



ISLAMIC STUDIES



GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN: 978-81-7898-655-5



9 7881 7898 6555